© rasailojaraid.com

اپنے مدلل و حکیمانہ تجزیے سے بکھیر دیے ہیں۔

مجدد عصر

آج کے معاشرے کے حالات ورجحانات پر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے جو تنقید کی ہے اور ان کی خرابیوں کی اصلاح کے لیے جو تجویزیں اپنی مذکورہ بالا کتابوں اور دوسرے لٹریچر میں پیش کی ہیں، وہ ایک عظیم الشان کارِ تجدید ہے۔ مولانا کی دعوت ایک انقلابی دعوت ہے جس کا خطاب مسلم و غیر مسلم معاشروں سے یکساں ہے۔ بلاشبہہ مولانا کا محورِ فکر اسلامی ہے اور قرآن وسنت کے احکام وہدایات پر مبنی ہے لیکن انھوں نے اول تا آخر اسلام کو ایک آفاقی نظریۂ حیات کے طور پر پوری انسانیت کی اصلاح و تجدید کے لیے پیش کیا ہے، اور وقت کے جتنے بنیادی مسائل ہیں ان کا حل ایک حکیمانہ انداز سے تجویز کیا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے دورِ جدید کے مریضانہ رجحانات پر، خواہ وہ کتنے ہی عام اور مقبول ہوں، ایسی کاری ضرب لگائی ہے کہ ان کا پول کھل گیا ہے اور ان کی تباہ کاری واضح ہوگئی ہے۔

فتنہ وفساد، بے پردگی، سود، مغربی جمہوریت، ضبط ولادت جیسے عالم گیر مہلک امراض کی صحیح تشخیص کر کے ایک عالمانہ بصیرت وجرأت کے ساتھ ان کے علاج کا نسخۂ شفا تجویز کرنا، ایک بے مثال کارنامہ ہے جو مولانا مودودیؒ کی تحریک اسلامی نے انجام دیا ہے۔ فکر وعمل دونوں کے اعتبار سے اس تحریک کی رہنمائی مسلم و غیر مسلم معاشروں کے لیے عام ہے۔ اس سلسلے میں مولانا کا لٹریچر رائج الوقت غلط افکار وخیالات کی قطعی تردید کر کے ان کے متبادل صحیح نظریات وتصورات مؤثر ترین اسلوب میں پیش کرتا ہے۔ ان حقائق کے مدنظر عصر حاضر میں مولانا مودودیؒ کو صرف مسلم امہ کا نہیں بلکہ پوری انسانیت کا مجدد کہا جاسکتا ہے۔ ضرورت ہے کہ مولانا کی تحریروں کو مناسب طور سے دنیا کی تمام زبانوں میں شائع کیا جائے اور ان کی دکھائی راہوں پر عمل کرنے کی تدابیر اختیار کی جائیں۔

غیر مسلم معاشروں میں تحریک کا طریق کار

۱- مولانا مودودیؒ نے اسلامی تحریک کی رہنمائی کا جو کام اپنے لٹریچر سے کیا ہے، اسے غیر مسلم معاشروں میں ایک انسانی تحریک کی حیثیت سے، جو فی الواقع اسلامی تحریک بجائے خود ہے، پیش کیا جائے۔ اس لیے کہ انسانیت کی اصلاح وترقی، یعنی انسان دوستی یا انسان سازی ہی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مولانا کی ساری جدوجہد کا منشا و مقصود رہا ہے۔ اسی لیے انھوں نے اسلامی نظریۂ حیات اور موجودہ مسلم فرقے کے درمیان فرق و امتیاز کیا' اور خلافت راشدہ کے بعد کی عام مسلم تاریخ کو خالص اسلامی تاریخ کہنے سے انکار کیا۔

۲- مختلف اہم موضوعات پر مولانا کے مباحث کا خلاصہ انھی کی تصانیف سے' انھی کے لفظوں میں تیار کر کے ہر قابل ذکر زبان میں وسیع پیمانے پر شائع کیا جائے۔

۳- اس مقصد کے لیے ایک علمی ادارہ کسی معروف مصنف کے زیر قیادت مستعد رفقائے کار کے ساتھ مناسب مقام پر قائم کیا جائے' جس میں رہایش وغیرہ کی تمام ضروری سہولتیں اور نشرواشاعت کے جدید ترین کاروباری وسائل مہیا ہوں۔ ابتدائی و بنیادی سرمائے کے ساتھ یہ ادارہ حتی الوسع خود کفیل ہو جائے اور اپنی جگہ خود مختار ہو۔

۴- افکار مودودی کی اشاعت اور اس کے مطابق مسلم یا غیر مسلم معاشرے میں عملی جدوجہد کے لیے دنیا کے جو ادارے بھی تعاون کرنا چاہیں' ان کے ساتھ تعاون کیا جائے۔

۵- غیر مسلم معاشروں کی سب سے مقبول زبان انگریزی ہے۔ لہٰذا اس زبان پر قدرت رکھنے والوں سے ادبیات مودودی کی تلخیص و ترتیب کا کام لیا جائے۔

۶- مغرب کی زبانوں میں فرانسیسی' جرمن' روسی' اطالوی اور مشرق کی زبانوں میں عربی' فارسی' چینی' جاپانی' ہندی' بنگلہ' سواحلی وغیرہ میں بھی کام کیا جائے۔

۷- مولانا مودودیؒ کے خیالات کو فکری و عملی طور پر پھیلانے کے لیے دینی جذبے سے سرشار کارکن' رکھے جائیں' جو کھلے ذہن اور صالح کردار کے ساتھ کام کریں۔

نظریاتی مقابلے کے موجودہ دور میں وہ جدوجہد بہت ضروری ہے جس کا ایک مختصر خاکہ اوپر پیش کیا گیا۔ اس سلسلے میں تاخیر و تامل نقصان دہ ہوگا۔ آج عالمی ذرائع ابلاغ (Media)' خاص کر ٹی وی اور انٹرنیٹ کے ذریعے' ایک وحشیانہ تہذیب و تمدن' کو سائنس اور ٹکنالوجی کے بل پر' فروغ دے رہے ہیں۔ لہٰذا' ان کو ناکام بنانے اور صحت مند تعمیری اقدارِ انسانیت کو نمایاں کرنے میں مزید تاخیر کو راہ نہ دی جائے۔ اس معاملے میں مستعدی و چستی وقت کی پکار ہے!

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مولانا مودودیؒ اور امام ابن تیمیہؒ

ڈاکٹر محمود احمد غازی°

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا شمار بلاشبہہ بیسویں صدی کے نامور ترین مفکرین اور علماے اسلام میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنی ۶۰ سالہ علمی اور ادبی زندگی میں دینی' ملّی اور اجتماعی زندگی کے کم و بیش ہر پہلو پر لکھا ہے۔ ان کی تحریروں کا بنیادی مطمح نظر فکر اسلامی کی تجدید' مسلم معاشرے کی تشکیل نو اور مسلمانوں کی گمشدہ اسلامی میراث کی بازیافت ہے۔ اپنی ابتدائی تحریروں میں مولانا مودودیؒ کے خیالات پر جن دینی شخصیتوں کے اثرات غیر معمولی طور پر محسوس ہوتے ہیں' ان میں آٹھویں صدی ہجری کے مشہور مجدد اور مصلح علامہ ابن تیمیہؒ کا نام نمایاں طور پر سامنے آتا ہے۔ ابن تیمیہؒ سے مولانا مودودیؒ کی عقیدت بہت قدیم بھی ہے اور ابتدا میں بڑی شدید بھی تھی۔ مولانا کی جن کتابوں کو ان کے نظام فکر میں کلیدی حیثیت حاصل ہے' ان میں تجدید و احیاے دین ایک نمایاں مقام رکھتی ہے۔ یہ کتاب دراصل ایک مقالہ تھا جو انھوں نے ۱۹۴۰-۴۱ء میں الفرقان کے شاہ ولی اللہؒ نمبر کے لیے لکھا تھا۔ مولانا نے اس مقالے میں نہ صرف تصورِ تجدید اور احیاے دین پر مفصل بحث کی اور اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کیا' بلکہ اسلامی تاریخ کی جن نامور شخصیتوں کو وہ تجدید و احیاے اسلام کا نمایندہ سمجھتے ہیں اُن کے کام پر بھی انھوں نے روشنی ڈالی ہے۔

اس مقالے یا کتاب کی تصنیف کے دوران مولانا مودودیؒ کے ذہن میں تجدید کا

° نائب صدر' بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی' اسلام آباد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جو خاص تصور تھا اس کو سامنے رکھتے ہوئے انھوں نے مختلف مجددین کے کام پر تبصرے کیے اور جہاں جہاں بہتری کی گنجایش محسوس کی اس کی نشان دہی کی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلی جنگ عظیم کے بعد دنیاے اسلام کو جس شکست و ریخت کا سامنا کرنا پڑا، اس نے مولانا کے نوجوان ذہن اور حساس دل پر گہرا اثر ڈالا۔ انھوں نے یہ محسوس کیا کہ دنیا میں ہر جگہ مسلمان ہی زوال کا شکار ہیں، اور زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نظر نہیں آتا جس میں مسلمانوں کا زوال نمایاں نہ ہو۔ اس ہمہ گیر زوال اور کمزوری کے احساس نے مولانا کے تصورِ تجدید پر گہرا اثر ڈالا۔ جس زمانے میں وہ یہ مقالہ لکھ رہے تھے ان دنوں دنیاے اسلام میں انحطاط و زوال کی بڑھتی ہوئی تاریکیوں کے مشاہدے نے ان کے دل میں تجدیدِ کامل کی ضرورت کا احساس پیدا کیا۔ چنانچہ اس پوری کتاب کی اٹھان مجددِ کامل یا تجدیدِ کامل کے تصور پر ہے۔ یہ تجدیدِ کامل جس کی ضرورت کا احساس مولانا کو بیسویں صدی کے نصف اول میں ہوا، اس کی روشنی میں جب انھوں نے بیسویں صدی سے پہلے کے مجددین کے کام کا جائزہ لیا تو کئی جگہ ان کو وہ خلا محسوس ہوا جو نہ خود ان مجددین کو محسوس ہوا تھا اور نہ کبھی دیگر مؤرخین نے اس کی نشان دہی کی۔

اس پس منظر میں جہاں مولانا مودودیؒ بہت سے مجددین کے کام کا جائزہ لیتے ہیں اور وہاں موجود اس خلا کی نشان دہی کرتے ہیں جو ان کو محسوس ہوا، وہیں وہ ابن تیمیہؒ جیسی قدآور شخصیت کا تذکرہ بھی بہت بھرپور انداز سے کرتے ہیں۔ ایسا ہونا شاید ناگزیر بھی معلوم ہوتا ہے کہ مولانا مودودیؒ نے انھی دنوں ابن تیمیہؒ کی تحریروں کا تازہ تازہ مطالعہ کیا تھا۔ ابن تیمیہؒ کے تذکرے میں جو جوش و خروش اور تاثر پذیری نظر آتی ہے اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ آٹھویں صدی کے بالغ نظر اور انتہائی پرجوش مصلح کے گہرے اثرات نوجوان مصنف اور مستقبل کے مصلح کے قلم پر پڑ رہے ہیں۔ اس بات کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ اس مقالے کے لکھے جانے سے کچھ ہی قبل، ۱۹۳۷ء اور ۱۹۳۸ء کے سالوں میں، مولانا نے ابن تیمیہؒ اور ان کے شاگرد رشید ابن القیمؒ کی تصنیفات سے بہت استفادہ کیا۔

ابن تیمیہؒ کے اثرات مولانا پر ایک دوسرے راستے سے بھی پہنچے۔ یہ راستہ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی کتاب حجۃ اللّٰہ البالغہ ہے۔ حجۃ اللّٰہ البالغہ کے بارے میں بعض

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ارباب نظر کا کہنا ہے کہ اس کے بعض حصے ابن تیمیہؒ کی کتابوں کے براہ راست اثرات کے تحت لکھے گئے۔ اگر ایسا نہ بھی ہو تو بھی حجۃ اللّٰہ البالغہ کے بعض ابواب اور علامہ ابن تیمیہؒ کے خیالات میں حیرت انگیز مماثلت پائی جاتی ہے۔ یہ بات بھی بڑی اہم ہے کہ مولانا نے ۳۹-۱۹۳۸ء کے سالوں میں حجۃ اللّٰہ البالغہ کے بعض حصوں کا ترجمہ کیا۔ یہ وہ حصے تھے جہاں شاہ ولیؒ اللہ کے افکار اور ابن تیمیہؒ کے خیالات میں گہری مشابہت پائی جاتی ہے۔ یہ مضامین جو حجۃ اللّٰہ البالغہ کے مختلف ابواب کے آزاد ترجمے سے عبارت ہیں، ۳۹-۱۹۳۸ء کے سالوں میں ترجمان القرآن میں شائع ہوئے۔

ان مقالات کے موضوعات کے ایک سرسری جائزے سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ مولانا مودودیؒ اور خود شاہ ولیؒ اللہ کے خیالات پر ابن تیمیہؒ کے اثرات کہاں کہاں ہوئے ہیں۔ چند عنوانات ملاحظہ فرمائیں: ۱-توحید و شرک، ۲-حقیقت شرک، ۳-اقسام شرک، ۴-علوم نبوی کی اقسام، ۵-مصالح اور شرائع کا فرق، ۶-نبی سے اخذِ شرع کی کیفیت، ۷-چوتھی صدی ہجری کا فقہی و مذہبی اختلاف، ۸-دین میں تحریف اور بدعت کے اسباب، ۹-اسلام کا فلسفہ عمران، ۱۰-اسلامی قانون معیشت، اس کی روح اور اصول، ۱۱-اہم ترین تمدنی مفسدات کا انسداد، ۱۲-نرخوں کا حکماً مقرر کیا جانا، ۱۳-معاملات میں فضل اور فیاضی، ۱۴-اختلافی مسائل اور نقطۂ عدل۔ ان جیسے عنوانات سے یہ بات پورے طور پر سامنے آ جاتی ہے کہ ابن تیمیہؒ کے اثرات مولانا مودودیؒ کے افکار پر کن کن راستوں سے پڑ رہے ہیں۔

موضوعات و خیالات کے اس اشتراک کے علاوہ بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کو ابن تیمیہؒ کی شخصیت میں ایک ایسا دینی آئیڈیل نظر آیا جس کے نظریات، تحریریں، تحریکی ردعمل اور رویہ ان کو خود اپنے خیالات، تحریروں اور رویے سے بہت ملتا جلتا معلوم ہوا۔ ان دونوں شخصیتوں میں یہ مشابہت اتنی گہری اور نمایاں ہے کہ ان دونوں کے کام اور افکار کا کوئی ناقد اور مبصر اس سے صرف نظر نہیں کر سکتا۔

مزید برآں دونوں فکروں کو جس فکری ماحول میں کام کرنے کا موقع ملا وہ بھی قریب قریب یکساں ہی تھا۔ ابن تیمیہؒ نے جس دور میں آنکھیں کھولیں وہ سیاسی اعتبار سے افراتفری اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عسکری اعتبار سے مسلمانوں کی پستی کا دور تھا۔ مشرق سے جنگجو تاتاریوں کا سیلاب جو کم و بیش ۱۰۰ سال قبل اٹھا تھا' اس نے دنیاے اسلام کے شہر زمین بوس کر دیے تھے اور لاکھوں بے گناہ کلمہ گو مسلمانوں کو تہہ تیغ کر ڈالا تھا۔ تاتاریوں کی ان تباہ کن ترک تازیوں کے نتیجے میں چند ایک کے علاوہ جن میں دہلی کی سلطنت بھی شامل تھی' دنیاے اسلام کی تمام بڑی بڑی حکومتیں ایک ایک کر کے یا تو سرنگوں ہو چکی تھیں اور لرزہ براندام تھیں' یا بالکل ہی دم توڑ چکی تھیں۔

کم و بیش یہی منظر مولانا مودودیؒ نے بیسویں صدی میں دیکھا۔ اس صدی کی تیسری دہائی مسلمانوں کی تباہی کے وہ عبرت ناک منظر لے کر آئی جس کی کوئی نظیر اگر اسلام کی تاریخ میں ملتی ہے تو وہ تاتاریوں ہی کی ہولناکیوں میں ملتی ہے۔ یہ وہ دور تھا جب سلطنت عثمانیہ دم توڑ رہی تھی' مشرقی یورپ میں جگہ جگہ مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی جا رہی تھی اور مختلف مغربی طاقتیں ایک ایک کر کے دنیا بھر کی مسلم ریاستوں کو تاخت و تاراج کر رہی تھیں۔ انڈونیشیا سے لے کر مراکش تک اور تاتارستان سے لے کر زنجبار تک کوئی مسلم حکومت ایسی نہ تھی جو دنیاے مغرب کے پنجے تلے نہ کراہ رہی ہو۔

تاہم' تاتاریوں کی تاخت و تاراج اس اعتبار سے مغربی تاراج سے بہتر تھی کہ تاتاریوں کی لائی ہوئی تباہی کے اثرات صرف عسکری اور مادی پہلوؤں تک محدود تھے۔ تاتاریوں نے بلاشبہہ لاکھوں انسان تہہ تیغ کیے' درجنوں شہر زمیں بوس کیے' سیکڑوں کتب خانے نذر آتش کیے اور بے شمار کھیتیاں اور نسلیں برباد کیں۔ لیکن اس سب کے باوجود تاتاریوں کے نہ کوئی مذہبی عزائم تھے' نہ کوئی تہذیبی ایجنڈا تھا اور نہ کوئی ثقافتی اور تمدنی منصوبہ تھا۔ کم از کم ان میدانوں میں انھوں نے مسلمانوں سے کوئی تعرض نہ کیا۔ اس کے برعکس مغرب کی استعماری قوتیں ایک مذہبی پروگرام کے ساتھ دنیاے اسلام میں داخل ہوئی تھیں۔ ان کا ایک مفصل تہذیبی ایجنڈا بھی تھا اور ایک تعلیمی پروگرام بھی۔ اس لیے جو منفی اثرات بیسویں صدی کی تباہی اور زوال کے نتیجے میں پیدا ہوئے وہ ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری کی تباہی کے مقابلے میں کئی گنا بڑھ کر تھے۔ اس سے یہ نتیجہ بلاخوف تردید نکالا جا سکتا ہے کہ جو فکری چیلنج مولانا مودودیؒ اور ان کے ہم عصر مفکرین کے سامنے تھا وہ اس سے کہیں بڑھ کر تھا جس کا سامنا ابن تیمیہؒ کو کرنا پڑا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ابن تیمیہؒ اور مولانا مودودیؒ دونوں نے اپنے اپنے دور میں ان فکری چیلنجوں سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کی جو ان کے دور میں مسلمانوں کو درپیش تھے۔ لیکن یہ حقیقت پیش نظر رکھنی چاہیے کہ ابن تیمیہؒ جس چیلنج کا سامنا کر رہے تھے وہ یونانی منطق اور فلسفے کا پیدا کردہ تھا۔ بلاشبہہ ابن تیمیہؒ کی نقض المنطق اور الرد علی المنطقیین انتہائی عالمانہ کتابیں ہیں اور یونانی منطق پر مسلمانوں کی تنقید کا بہترین نمونہ ہیں۔ لیکن دوسری طرف یہ بھی امر واقعہ ہے کہ ابن تیمیہؒ کے دور تک آتے آتے یونانی منطق اور فلسفہ ویسے ہی ادھ موئے ہو چکے تھے۔ مسلمانوں میں ابن تیمیہؒ سے پہلے غزالیؒ اور رازیؒ جیسے اساطین علم وفکر یونانی منطق اور فلسفے پر زبردست اور تابڑتوڑ حملے کر چکے تھے اور اب یونانی منطق اور فلسفے کے خلاف آواز اٹھانا آسان بھی تھا اور اس کے لیے مواد بھی دستیاب تھا۔

اس کے برعکس جب مولانا مودودیؒ اور ان کے ہم عصر دوسرے مسلم مفکرین نے تنقیدِ مغرب کے کام کا آغاز کیا تو مغربی افکار و نظریات انتہائی تازہ دم اور ہر قسم کی تنقید کو سہنے کے لیے پورے طور پر تیار تھے۔ جن دنوں امام غزالیؒ اور امام رازیؒ یونانی منطق پر تنقیدیں کر رہے تھے، وہ دور اہل مغرب کے بالعموم اور اہل یونان کے بالخصوص سیاسی انحطاط اور کمزوری کا دور تھا۔ یہ وہ دور ہے جب کم از کم یورپ میں کوئی سیاسی قوت ایسی موجود نہ تھی جو یونانی افکار کے تحفظ اور دفاع کے لیے کھڑی ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ غزالیؒ اور رازیؒ اور ان کے بعد ابن تیمیہؒ کی تنقیدوں کے جواب میں جو آوازیں منطق اور فلسفے کے دفاع میں اٹھیں ان کو کسی حکومت یا سیاسی قوت کی تائید حاصل نہ تھی۔ ان حضرات کی کاوشوں کی علمی قدر و قیمت اپنی جگہ، لیکن کیا یہ امر واقعہ نہیں کہ یہ حضرات ایک ایسے فلسفے اور نظریے پر تنقید کر رہے تھے جس کو ہم بلاخوف تردید سیاسی اعتبار سے ایک یتیم فلسفہ قرار دے سکتے ہیں۔ اس کے برعکس جس فلسفے اور نظریے کو مولانا مودودیؒ اور ان کے معاصرین نے تنقید کا نشانہ بنایا، اس کی پشت پر بڑی بڑی مضبوط سلطنتیں اور سیاسی قوتیں موجود تھیں جن کا سوچا سمجھا مطمح نظر اور طے شدہ ایجنڈا ہی یہ تھا کہ اپنی سیاسی قوت کو اپنے نظریات کے فروغ میں استعمال کیا جائے۔

بیرونی افکار پر تنقید اور مغربی فکر و فلسفے کے ناقدانہ جائزوں اور تبصروں سے قطع نظر ان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دونوں حضرات کی علمی اور دینی کاوشوں کا اہم ترین میدان تجدید و اصلاحِ دین ہے۔ مسلمانوں میں رائج دینی تصورات کی قرآن وسنت کی روشنی میں تنقید اور کمزور پہلوؤں کی اصلاح ان دونوں شخصیتوں کے کام اور دل چسپی کا اصل میدان ہے۔ دونوں کو اپنے معاصر علما اور دینی اکابر کی شدید تنقیدوں کا سامنا کرنا پڑا۔

یہ بھی ایک امر واقعہ ہے کہ ان دونوں شخصیتوں کا لب ولہجہ اور زور بیان اختلافی مسائل و معاملات میں ایک دوسرے سے بہت مشابہ ہے۔ اس بات کو زیادہ واضح اور دوٹوک انداز میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ جس زور شور سے ان دونوں حضرات کا قلم تنقیدی مسائل پر اٹھتا ہے وہ اپنی ایک الگ ہی شان رکھتا ہے۔ غالباً یہ بتا دینا خلاف ادب نہ ہوگا کہ ان دونوں حضرات کے خلاف ان کے معاصر علما کے لہجوں میں شدت کا ایک اہم سبب ان حضرات کا وہ انداز بیاں بھی تھا جو انھوں نے اختلافی معاملات میں اختیار فرمایا۔

مولانا مودودیؒ اور ابن تیمیہؒ دونوں اپنے اپنے اجتہاد وتفردات میں بھی ایک دوسرے سے بڑی مشابہت رکھتے ہیں۔ یہ کہنا شاید غلط نہ ہو کہ ان تفردات کا ایک نقصان یہ بھی ہوا کہ نہ صرف خود یہ دونوں حضرات بلکہ ان کے مخاطبین، متاثرین اور ہمدردوں کی بڑی تعداد کی توجہ اور صلاحیتیں اپنے اپنے تفردات کا دفاع کرنے میں صرف ہوئیں اور اصلاح عقائد اور تعمیر ملت کا وہ کام پس منظر میں چلا گیا جس کا حصول ان دونوں جلیل القدر بزرگوں کا مقصود اولین تھا۔

عقلیات مغرب پر تنقید کے باب میں جہاں مولانا مودودیؒ اور ابن تیمیہؒ میں خاص مشابہتیں پائی جاتی ہیں وہاں ان دونوں حضرات میں کئی اعتبار سے فرق بھی ہے۔ چونکہ مولانا اصلاً ایک سیاسی مفکر اور ایک ایسی جماعت کے سربراہ تھے جس نے انتخابی سیاست میں بھرپور حصہ لیا، اس لیے مولانا کی تنقید میں سیاسی اسلوب اور مکالمے کا رنگ جھلکتا ہے۔ جہاں مولانا مغرب کی فکری کمزوریوں کی نشان دہی کرتے ہیں وہاں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے مخاطبین کو اٹھ کھڑا ہونے اور کچھ کر گذرنے پر آمادہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے ان کی تنقید میں خالص علمی اور فکری دلائل کے ساتھ ساتھ ایک سیاسی قائد کا سا خطیبانہ انداز بھی نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ یوں بھی مولانا کے ہاں خطابی دلائل ان کی ابتدائی تحریروں میں کثرت سے ملتے ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس کے برعکس ابن تیمیہؒ اصلاً ایک فقیہہ، متکلّم، مناظر اور محدث تھے۔ اس لیے ان کی تنقیدی تحریریں ذرا مختلف انداز کی ہیں۔ ایک محدث کی سی دقتِ نظر، جزئیات کو بیان کرنے کا محدثانہ اسلوب اور مغربی افکار پر خالص دینی نقطۂ نظر سے تنقید کے دوران بھی ابن تیمیہؒ منطقی دلائل کا استعمال کرتے نظر آتے ہیں۔

یوں تو مولانا مودودیؒ اور ابن تیمیہؒ دونوں کے ہاں عقل و نقل کا امتزاج یکساں طور پر پایا جاتا ہے لیکن اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ابن تیمیہؒ کا زیادہ زور نقل پر اور مولانا کا عقل پر ہے۔ شاید اس کی وجہ بھی یہ ہے کہ ابن تیمیہؒ کی ذہنی تشکیل اور علمی ساخت علمِ حدیث کے ماحول میں ہوئی، اس لیے ان کی تحریروں پر نقل کا اسلوب غالب ہے۔ اس کے برعکس مولانا مودودیؒ اپنے ابتدائی کیریئر میں چونکہ صحافی رہے، اس لیے ان کو عامۃ الناس کی سطح پر بڑی تعداد میں ایسے لوگوں کو اپنا مخاطب بنانا پڑا جو کسی دینی پس منظر کے حامل نہ تھے، چنانچہ انھیں لازماً ایسا اسلوب اپنانا پڑا جس میں اپیل کی اصل بنیاد نقل کے بجائے عقل ہو۔ چنانچہ عقلی اپیل کا یہ اسلوب مولانا کی تحریروں کا طرۂ امتیاز بن گیا۔ اس اسلوب کا ایک نمایاں مظہر یہ بھی ہے کہ جہاں مولانا خالص دینی معاملات پر گفتگو کرتے ہیں وہاں بھی ان کے طرز استدلال میں عقل کا پلہ بھاری نظر آتا ہے۔ اس کی نمایاں مثال ان کی کتاب سنت کی آئینی حیثیت ہے جو ایک ایسے موضوع پر ہے جس کا تعلّق خالصتاً نقل کے میدان سے ہے، لیکن اس کتاب میں بھی مولانا کا عقلی استدلال (بمقابلہ نقلی دلائل) نمایاں اور غالب معلوم ہوتا ہے۔

ان دونوں شخصیتوں کا ایک اہم اور مشترک وصف ان کا داعیانہ جوش بھی ہے۔ یہ داعیانہ جوش مولانا مودودیؒ کی ابتدائی تحریروں میں بہت نمایاں نظر آتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ (بالخصوص قیام پاکستان کے بعد) جب مولانا کو سیاسیات کے تلخ حقائق سے واسطہ پڑا تو ان کے ہاں گفتگو اور مکالمے میں ایک نیا انداز سامنے آیا۔ اس نئے انداز میں نسبتاً زیادہ ٹھیراؤ، زیادہ احتیاط اور زورِ بیان کی ارادی کمی معلوم ہوتی ہے۔

غالباً ابن تیمیہؒ کو ایسی کسی صورتِ حال سے دوچار نہیں ہونا پڑا اس لیے ان کے ہاں ایسی کوئی تبدیلی نمایاں طور پر محسوس نہیں ہوتی۔ البتہ زورِ بیان دونوں کے ہاں غیرمعمولی ہے۔

© rasailojaraid.com